ڈاکٹر محمد رؤف بھٹی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد
Dr.Muhammad Rauf Bhatti
Assistant Professor of urdu, Govt. Graduate College Samanabad Faisalabad

سوشل میڈیائی سوم رَس: علمیاتی و ادبی تناظر

Social-mediatic"Soom Ras":epistimological and literary perspective

Abstract

In literal sociology, we try to study a society in the light of literary text and literary content in the perspective of social environment. Social analysis-processing and derivation of cultural code of conduct therefrom has been in vogue since Platonic times. Today our society has changed a lot due to warm welcome of virtual values and practices. Hence, there is a dire need to study our literature as a social medium of expression to coin required basic practical poetics in compliance with this new social mediatic situation so that we may be able to properly judge the new environment and act accordingly. In this article, an attempt has been made to study the virtual world of ours in the light of some literary, co-literary and religious content.

کلیدی الفاظ:
سوشل میڈیا، ادبی سماجیات، جارج آرویل، ۱۸۸۴ء، آلڈس ہکسلے، بریو نیو ورلڈ، سوم رس، سٹاک ہوم سینڈروم، امتزاجی حکمت عملی، قران حکیم، تقویٰ

اتوار ۲۲ / جنوری ۲۰۲۱ء؛ زوالِ عصر سے ذرا پہلے کا عمل تھا کہ ادھر ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم کی علمی تنظیم "بصائر" کا اوّلین جلسہ خواجہ عبد السلام روڈ پر واقع ایمز نامی درس گاہ میں وقوع پزیر ہوا۔ یوں لگا جیسے زینہ زینہ اترتی شبِ تار کے مقابل کوئی سالکِ راہ قندیلِ رہبانی کا سامان کیے جاتا ہو کہ اس علمی بیٹھک کا موضوعِ بحث تھا:

"سوشل میڈیائی رجحانات: محرکات اور اثرات"

لمحۂ موجود کا ایک سلگتا ہوا بکھیڑا، یعنی عین وقت کی راگنی۔ بلاشبہ سوشل میڈیائی معاملہ بندیاں اور سماجی فعالیتیں تازہ خون کی طرح ہماری نس نس میں سما گئی ہیں، لہٰذا اس پر ڈسکورس کی تشکیل ایک فطری اقتضا ہے جس کی ایک کلیدی جہت تخلیقی سروکار بھی رکھتی ہے۔ ادبی سماجیات کسی تخلیقی سرمائے کی روشنی میں اس کے متعلقہ سماج اور سماجی صورتِ حال کے تناظر میں ادبی متون کو جانچنے پرکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سماجی مطالعات میں ادب سے مدد لینے کی روایت افلاطون سے شروع ہو کر افتاں و خیزاں آج تک برابر چلی آئی ہے۔ فی زمانہ انسانی سماج ورچوئل اقدار و اعمال کی حد درجہ پزیرائی کے سبب ایک منقلب صورت حال اختیار کر چکا ہے، لہٰذا اس عہد کے ادبی سرمائے کو مذکورہ ورچوئل سماج کے وسیلۂ اظہار کے طور پر دیکھتے ہوئے ہمیں ایسی شعریاتی حکمتیں نشان زد کرنے کی کوشش کرنی

چاہیے جن سے اس منقلب معاشرے کے "تازہ خداؤں" کی چیرہ دستیوں سے نہ صرف آگاہی میسر آئے بلکہ ان سے نبرد آزمائی کے سلسلے میں بھی کوئی صائب ضابطۂ عمل ترتیب دیا جاسکے۔

خاکسار کو دعوتِ اظہار ملی تو گفتار کا اسلوب قدرے ناروا ہو چلا۔ معروضات تجزیاتی تھیں مگر سیاقی مباحث کے گاڑے پس منظر نے انھیں جبراً مقطع کی سخن گسترانہ بات کا پیش منظر بنا دیا۔ اکابرین کا فکری میلان اس اجتماعی نکتے کی اور تھا کہ یہ آفتِ زمانہ ہمارے کلچرل تشخص کی بدھیا بٹھائے جاتی ہے۔ دفاعی حکمتِ عملی کی کم یابی بل کہ نایابی پر بھی متاسّفانہ اظہارِ خیال کیا گیا مگر بقدرِ اشکِ بلبل۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی نامیاتی نشوارتقا میں بیم و رجا کے مرحلے ہمیشہ سے در پیش رہے ہیں؛ پھر ورچوئل ورلڈ کی نئی کارگاہِ عمل میں ممکناتِ جسم و جاں کو عیارِ تازہ سے ماپا جانے لگا تو اس پہ ہاہاکار کیسی؟ "ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور"۔ یہ ایک سنجیدہ سوال تھا، کسی اعتراض کا اَکھوا نہیں؛ مقصد مکالمے کا فروغ تھا، مناظرے کی تشویق کاری نہیں۔ محلِ نظر بات یہ رہی کہ موجودہ سائبر منظر نامے میں ہمارے زیادہ تر گیانی مسلم تہذیب و ثقافت کے ہر مظہر کو معرضِ خطر میں پاتے اور یہی نرسنگھیا بجائے جاتے تھے کہ "جو تھا، نہیں ہے، جو ہے، نہ ہو گا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ"۔ یہ تحفظات جزوی طور پر درست ہو سکتے ہیں، اور درست ہیں بھی، مگر کلّی طور پر قابلِ قبول نہیں۔ سوشل میڈیا کا فروغ ہمارے حواسِ خمسہ کے امکانی قویٰ میں نشوارتقا کی ایک منزل ہے۔ اس بات میں بھلا کیا برائی ہے کہ انسانی چشم و گوش کے لیے مژدۂ وصال اور نظارۂ جمال کے کچھ مزید امکانات روشن تر ہو چلے۔ حقیقتِ منتظر اپنے لباسِ مجاز میں نظر آنے کے لیے لبِ بام آ موجود ہوئی۔ "صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھایئے"۔ نظر کا وظیفہ ء اصلی بصارت نہیں بصیرت ہے۔ مبارک شاہ کی بات میں پرکھوں کی دانش کشید ہوئی ہے:

'بصیرت' ہو تو اک لمحے کی بینائی غنیمت ہے
وگرنہ سیب تو ٹہنی سے پہلے بھی گرا ہو گا

فلک نادرہ کار اقوام و ملل کی باہمی نبرد آزمائی کے لیے فکر و عمل کی نوع بہ نوع قمار گاہیں سجاتا رہتا ہے اور مواصلات کے شعبے میں سوشل میڈیا کی حالیہ کارفرمائی بھی ایک ایسی ہی بساطِ مسابقت ہے جو سیموئیل مورس کے ایک سادہ سے ٹیلی گراف کی ترسیل سے شروع ہو کر لمحۂ موجود کی گوگل، فیس بک اور یوٹیوب جیسی نہایت بسیط اور لطیف ویب سائیٹس کی صورت مسلسل اپنی کشادہ کاری کا ساماں کیے جاتی ہے۔ فی زمانہ اسی بساط پر مہرہ بازی کے جوہر دکھانے میں فلاح و اصلاح اور نشوارتقا کے حیات آفریں (Bioactive) مژدے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نیا امکانی منظر نامہ ہمارے سماج کو ایک اگلے تہذیبی پڑاؤ کے لیے ارتقائی ہجرت (Altitudnal Migration) کی طرف بلا رہا ہے اور یہی صلائے عام اسے سراپا شر سمجھنے والوں کے لیے ایک دعوتِ فکر بھی ہے۔ ایک فارسی شاعر نے نگارِ امکان کی ایسی دل پزیر رونمائی پر ردّ و قبول کے سلسلے میں اچھا تقابل موزوں کیا تھا:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بُستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

سوشل میڈیا کے ممکنہ خدشاتی نتائج کا خوف ہمیں امکانات سے مالا مال اس عہد کے تقاضوں کی تجزیہ کاری اور اخذ و استفادہ کی صائب منہج اختیار کرنے سے غافل کر دے تو یا قسمت، ورنہ ہمہ جہتی علمی پیداور اور اس کی آسان تر تحصیل و ترسیل کے حالیہ دور میں

انسانی شرف یابی کے فروغ کا ایسا ہی موقع ارزاں ہوا ہے کہ جس کی نظیر ماضی میں زبان کے سیکھنے یا تحریر کی ایجاد سے نصیب ہوا تھا۔ اس زرخیز کشتِ امکان سے خوشہ چینی کے لیے مگر شرط سلیقہ ہے اور فی زمانہ اقوامِ عالم کی باہمی مسابقت میں کامیابی کا پیمانہ بھی اسی سلیقہ شعاری کے اہتمام سے عبارت ہو گا۔ رزمِ حق و باطل یا تنازع للبقا کا یہ پانچواں دور چل رہا ہے؛ توقعات بھی فراواں اور خطرات بھی بے شمار۔ مشرق کے حکیم الامت شاعر نے حقے کا لمبا ساکش لے کر رشید احمد صدیقی کی گرہ میں کیا موتی باندھا تھا! ''نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔''(۱)

فرہاد کی آزمائش اور تھی، منصور کی اور؛ مگر لمحۂ موجود میں کوہ کنی کی اڑچن ہے نہ ہی نخلِ دار کو بار آور کرنے کا فریضہ، یاروں کو محض 'سوم رس' کے کیف میں توازن بنائے رکھنا ہے اور بس؛ جو سنبھل چلے وہی سکندر۔ جارج آرویل کے اینٹی یوٹوپیائی ناول ''۱۹۸۴ء'' میں ایک ایسی جابر حاکمیت کی پیش بینی کا سراغ ملتا ہے جو قید و بند کے جیسے استحصالی حربوں سے انسانوں کے فکری قویٰ کو مقید کر کے ریاست کا انتدابی چلن رو بہ عمل لائے گی۔(۲) سرمایہ دارانہ نظام کی عالمی بالا دستی سے اس بات کی جزوی تصدیق بھی ہوئی۔ عالمی گاؤں میں ایک نیو ورلڈ آرڈر کی عمل داری کے خدوخال تک ابھرے مگر ۱۱ /۹ کی صورت ایسے ریاستی استحصال کی ساخت شکن مستثنیات بھی برابر جلوے دکھاتی رہیں۔ کوئی جائے اور جا کر میرے دوست پروفیسر خاقان اجمل کو سمجھائے کہ فریق ثانی کے موقف سے متاثر ہوئے بغیر اسے توقیر نا مکالمے کی اخلاقیات کا بنیادی اصول ہے۔ ہاں مگر آلڈس ہکسلے کے ایک ایسے ہی اینٹی یوٹوپیائی ناول ''بریو نیو ورلڈ'' میں جس جبر فری ریاستی پالیسی (Suger-Coated Policy) کا تصور دیا گیا ہے، اہلِ نظر کے لیے محلِ غور ہے۔ اس ناول میں پیش کردہ ہائی بریڈ سماج میں ہر فرد بشر بنیادی انسانی حقوق کے نام پر ''مکمل آزادیاں'' انجوائے کرتا ہے۔ یہاں عوام کی یوں نفسیاتی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ معلومات کی کثرت اور تفریح و تعیش کے آزادانہ ماحول کے کیف میں دھت ہو کر اپنے سمجھنے سوچنے کے جبلی شرف سے بھی رضاکارانہ طور پر دست برداری اختیار کر لیتے ہیں۔ حدیث نبوی کے ایک مجموعے میں ایسے آشوبِ افراط کی ہلاکت خیزی کا بلیغ اشارہ ملتا ہے:

''اِنَّ مِمَّایُنْبِتُ الرَّبِیْعُ مَا یَقْتُلُ حَطَباًاَوْ یُلِمُّ''۔(۳)

مذکورہ ناول میں ہکسلے نے ایک کیف آور دوا ''سوما'' کا بھی ذکر کیا ہے جو فرقۂ باطنیہ کے جنونی فدائیوں کو دی جانے والی حشیش کی طرح اثر دکھاتی اور اپنے ماتوں (Addecteds) کی فکری صلاحیتوں کی قلب ماہیت کر کے انھیں سازشی بیانیوں سے ہم آہنگ کرنے میں معاونت کرتی ہے۔ اردو ناول ''فردوسِ بریں'' میں مذکور چھٹی صدی ہجری کے اس شاطر باطنی فرقے کا ایک کردار ''طورِ معنی'' اسی نوع کا نشہ (بھنگ) اپنے نووارد فداعی ''حسین'' کو پلا کر اسے اپنے منصوبہ بند تعقلاتی فریم ورک کا آلہ کار بناتا ہے:

> ''یکایک ایک خوب صورت نوعمر لڑکے نے آ کے ایک شربت کا لبریز جام طورِ معنی کے ہاتھ میں دے دیا اور طورِ معنی نے اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھا کے کہا ''اس جام کو پی اور ملکوت سے ایک درجہ اور قریب ہو جا''۔(۴)

کچھ ایسے ہی "بریو نیو ورلڈ" میں کچھ صدیاں آئندہ کی تصوراتی دنیا پر مشتمل بڑے بڑے کنڈیشننگ سنٹروں اور انسانی ہیچریوں میں قائم فرٹیلائزنگ رومز میں کنٹرولڈ اور منصوبہ بند (purpose-based) انسان نما جاندار تیار کیے جاتے ہیں جن کی فکری کنڈیشننگ ایسی ہی مسکرات (Soma) کی مدد سے ممکن بنائی جاتی ہے:

> "The service had begun.The dadicated soma tablets were placed in the centre of the table.The loving cup of strawberry ice-cream soma was passed from hand to hand and,with the formula "I drink to my annihilation,"twelve times quaffed(5)".

انسانی قوائے فکر و عمل پر تصرف دکھانے والی ایسی سحر کار چیز کو سنسکرت زبان کی منشیاتی اصطلاح کی رعایت سے "سوم رس" کی متبدل وضع کہہ لیجیے جو مکسلے کی مذکورہ بالا "سوما" سے بھی تجنیسی علاقہ بنائے لگتی ہے۔(۶) یوں بھی اس ناول کا اسمائی پیٹرن بالخصوص کرداروں کے رمزیہ نام ایسی مماثلت کی توثیق بھی کرتے ہیں۔ ایسے جہانِ نو کی ریاستی حکمت عملی میں کارفرما سٹیٹ آپریٹس کے موثرات کا ذکر کرتے ہوئے دیویندر اسّر لکھتے ہیں کہ یہاں :

> "انسان پہلے سے تیار کیے گئے منصوبوں اور منضبط سماج کی ضرورتوں کے مطابق تجربہ گاہوں میں تیار کیے جاتے ہیں۔ان کی تشکیل ان کے استعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ماس میڈیا کے نئے نئے ذرائع، پوشیدہ محرکات، نئی نئی ڈرگز اور برین واشنگ کے ذریعے انسان کے ضمیر اور عقل کو ختم کر کے ایک ایسے سماج کی بنیاد ڈالی جارہی ہے جس میں ذاتی حیثیت جیسی کوئی چیز نہیں ہوگی۔"(۷)

غور کیا جائے تو موجودہ دور کی سائبر سپیس میں وہی "سوما" سوشل میڈیا کی عطا کردہ بے شمار منصوبہ بند معلوماتی سائٹس اور سمگل کردہ ایقانات شکن بیانیوں کی صورت انسانی عقل و شعور پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے۔بساطِ خمار کے تازہ واردان کی شروعاتی خاطر مدارت اگر جلبِ منفعت سے بے نیاز رہ کر کی جاتی ہے تو ادھر میڈیا ماکیٹ میں بھی بلا دام کی ایم بیز، جی بیز، ایس ایم ایس آفرز، فون کالز اور بالا ہتمام صنفِ نازک کے ہاتھوں لوڈڈ سمّیں پیش کرنے جیسی متبسمی خدمات (Services with a smile) عہدِ حاضر کے جوانانِ شوخ و شنگ کو اس فتنۂ آخر زماں کی زلفِ گرہ گیر کا ویسا ہی اسیر کیے جاتی ہیں۔ایسے میں غالب کے ایسے تشویش کار مگر کمیاب ہیں جو گمان کر سکیں کہ "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔" ہمارے ہاں سوشل میڈیائی رجحانات کی پزیرائی اور حکومتی سطح پر لیپ ٹاپس کی تقسیم ایسے اقدام احسن تھے مگر دو ایک برس قبل ادارہ شماریات نے وطنِ عزیز میں سب سے زیادہ دلچسپی سے دیکھی گئی جن سائٹس کی تفصیلات جاری کی تھیں ان کا تذکرہ کرنے میں بھی خوفِ فسادِ خلق دامن گیر ہوتا ہے۔یہ ڈرامہ آگے کیا کیا سین دکھائے گا، ابھی کہنا قبل از وقت ہے کہ مذکورہ "سوم رس" رگ و پے میں نہیں اترا، ابھی فقط کام و دہن کی لذت یابی کا مرحلہ ہے۔ایسے میں یقیناً ہمیں ڈاکٹر تحسین فراقی کی چتاؤنی پہ کان دھرنا چاہیے:

> "حکمت واقعی مومن کی گم شدہ میراث ہے مگر گم شدہ ورثے کے بھیس میں فکر کی چرس درآمد کرنا یقیناً قابلِ نفرین حرکت ہے۔"(۸)

یہاں سوشل میڈیا کی تنقیص ہر گز مقصود نہیں کہ یہ تو محض معلومات و افکار کے باسہولت لین دین کا معاملہ ہے۔ انسان کے پرکھوں کی محنتِ شاقہ سے یہ عظیم مکاشفاتی صلاحیت کی حامل ٹیکنالوجی دستیاب ہوئی ہے جس کی بدولت آج ہماری رسائی ان منطقوں تک ہو چلی ہے جو چند ہی برس قبل تک ہمارے مرغِ تخیل کی پہنچ میں بھی نہ آتے تھے۔ آج ہم اپنے سائنسی اور تکنیکی دور کی تیز ترین فعالیتیں مثلاً آلاتِ حرب بشمول بائیولوجیکل وارفیئرز کی عمل داریاں، توپ و تفنگ کے دھانوں سے نکلتی آتش پرندہ، وسیع وبسیط فضاؤں میں جنگی جہازوں کی مڈھ بھیڑیں، آسمانی بجلی کا کوند تا جلال و جمال، تحت الارض مستور جغرافیائی تغیرات، سمندروں کی عمیق گپھاؤں میں چھپی آبی مخلوق اور ان کے معمولات؛ نیز اسی طرح آہستہ رو تفاعلات مثلاً نباتاتی نشوارتقا کے مراحل، رحمِ مادر میں متشکل ہوتے حیاتیاتی پیکر، اجرامِ فلکی کا حرکی میکانزم، عمیق سمندروں میں ڈکارتے بھنور کی آنکھ کے گردشی جلال کا شروعاتی فریم ورک، حتیٰ کہ روئے جاناں کے دل کش خدوخال اور سیلِ سندر تا کے اترنے پر ریگِ صحرا کی طرح اس پہ جھریوں کی سلوٹوں کے نزول جیسے نادر وقوعے تک کھانے کی میز پہ بیٹھے بیٹھے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میڈیکل سائنس میں میڈیائی آلات نے کائناتِ اصغر یعنی انسان کے درونے کی تمام فعالیتیں آئینہ کر دی ہیں اور ایسی تمام لطیف سرگرمیوں میں ماہرین کی مشّاق عمل داریوں کو محفوظ کر کے انھیں بڑے وسیع پیمانے پر تدریسی مقاصد کے لیے استعمال میں لانے کی راہ بھی ہموار ہو چکی ہے۔ الغرض یہ سائبر سپیس ہر طرح کے علوم و فنون کا ایک بحرِ زخّار ہے جس کا ''سوم رس'' حیات آفرین بھی ہے اور کشتہ صفات بھی۔ تریاقِ مسموم بھی ہے اور زہرِ ہلاہل بھی۔ ''ظرف کے فرق سے تاثیر بدل جاتی ہے''۔ شیخ سعدی نے کیا پتے کی بات کی تھی:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ سبزہ روید و در راغ خار و خس

سوشل میڈیا کے ساتھ ہمارا ارتباط بہ حیثیت مجموعی ایک صارف کا سا رہا ہے۔ سنجیدہ علمی حلقوں نے اس نہایت قابلِ توجہ سماجی پیش منظر کے ضمن میں کوئی منصوبہ بند ضابطۂ عمل وضع کرنے میں خاصی بے نیازی کا ثبوت دیا ہے۔ بعض امور میں دیر سے بننے والی پالیساں محض احساسِ زیاں کا کرب دوبالا کرنے کے کام آتی ہیں۔ ایسے میں بہر حال ہمارا خودکار معاشرتی لائحہ عمل تین حصوں میں منقسم نظر آرہا ہے:

(۱) مزاحمتی رویہ
(۲) مفاہمتی رویہ
(۳) امتزاجی رویہ

یہاں پہلی قسم کا رویہ روایت کو جامد تصوراتی حصار میں مقید خیال کرنے والوں کا ہے جو ایسی کسی بھی پیش رفت کو اپنے اعتقادی نظام اور عملی زندگی کے لیے سوہانِ روح خیال کرتے اور کوچۂ جاناں میں نہ جانا ہی عافیت جانتے ہیں۔ کبھی تدبر کی توفیق ارزاں ہو تو ان احباب کے لیے یہ بات بھی سبق آموز ہے کہ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں سوقِ عکاظ اور دیگر اسواق کے حوالے سے عوامی سرگرمیوں کی سمجھ بوجھ بلکہ دور کیوں جائیں ادھر ہندوستان میں اوّلین بزرگانِ دین نے میلوں ٹھیلوں میں اصلاحی مداخلت کر کے کشتِ اسلام کی آبیاری

میں کیا کردار ادا کیا تھا؟ صدیوں بعد اسلامیوں کی اس غلبہ آور حکمتِ عملی کو ایک نو آبادیاتی مفکر برنارڈ ایس کوہن نے اپنے مضمون ''زبان کی حاکمیت اور حاکمیت کی زبان'' میں یوں بیان کیا ہے:

"The conquest of India was a conquest of knowledge"(9)

دوسرے سماجی گروہ میں ایسے تمام افراد شامل ہیں جن کا تصورِ حیات ''اپی کیورین ماٹو'' سے مستنبط ہے اور وہ بغیر کسی زحمتِ فکر کے صارفیت کی لت (Shoping Addiction) میں پڑے اپنی قیمتی مہلتِ عمل اور وقیع جذبات واحساسات سمیت تن من دھن کے سبھی حاصلات داؤ پہ لگائے ورچوئل دنیا کی شہریت اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے کا تیسرا طبقہ میانہ رو فکر و عمل کا حامل ہے۔ یہ گروہ اس منظر نامے سے متعلق کسی التباسی حقیقت کی زد میں آکر مفاہمت یا مزاحمت دکھانے کے بجائے سائنس دانوں کی سی نیوٹریلیٹی یعنی عدم وابستگی کے ساتھ امکانات وخدشات کا تجزیاتی مطالعہ کر کے صائب ردّ عمل کی منہج اختیار کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس شدید عدم وابستگی میں ایک وابستگی کا پہلو البتہ ضرور ہوتا ہے اور وہ ہے انسانی فلاح و اصلاح کا پہلو۔ یہ حکمت عملی 'خذ ماصفا ودع ما کدر' کے اصول پر قائم ہے اور ردّ و قبول کا یہ منہج انسان ساختہ فکر و فلسفہ کے بجائے الوہی تعلیمات کی سیادت میں اخذ کیا گیا ہے۔ یہ مابعد الطبعیاتی کونیات میں رہتے ہوئے بشر مرکز کونیات کی اختراعات و ایجادات سے ربط و تعلق استوار کرنے کی ایک احسن اطلاقی صورت ہے۔ دنیائے کُن فیکون میں فکرِ سخن کرنے والوں پہ مضمونِ تازہ اور طبعی تدبّر کاروں پہ مکاشفات اور ایجاد و اختراع کا درِ امکان بند ہونے کا نہیں ہے۔ سماجی تاریخ کے اس ارتقائی تصور کو علامہ اقبال یوں شعریاتے ہیں :

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

لہٰذا عناصر کے اس کھیل میں ترتیب و ترکیب کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں جو کسی بھی زبان کی گرائمر (Langue) کے جیسے پس منظر میں رہتے ہوئے مضامینِ نوع بہ نوع کی صورت (parole) متشکل ہو کر کائناتِ ناتمام کی نشوو ارتقا کا سامان کرتے اور سمع و بصر کو نئے امکانات تک رسائی کا مژدہ سناتے ہیں۔ یہ جہانِ نو اپنی ماہیت کے اعتبار سے فطرت کا پروردہ اور نتیجتاً اسی کا ہم طبع بھی ہے مگر انسان کے ہاتھوں استعمال ہونے کی بنا پر اسے خیر و شر کے جیسے موضوعی انسلاکات بھی میسر آتے ہیں۔ آب و آتش کی مثل یہ نئی ایجادات انسانی فلاح و اصلاح کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں اور تسفیل و تخریب کا وسیلہ بھی۔ ہمیں ان ایجادات واختراعات کے ساتھ ذمہ دارانہ آزادی کے ساتھ ربط ضبط استوار کرنے کا چیلنج درپیش ہے۔ فطرت میں موجود ہر ذی روح کسی غیر معمولی چیز سے معاملہ بندی میں قدرتِ کاملہ کے عطا کردہ جبلی شعور کو اپنا رہنما بناتا ہے۔ پرندہ کسی انجانی ترغیب آور شے کو چونچ سے جانچ کر اور بلی مشروب لپڑنے سے قبل اپنی مشامِ تیز سے پرکھ کر اسے استعمال میں لانے یا نظر انداز کرنے کا فیصلہ کرتی ہے جو فی نفسہٖ ایک تحقیقی قرینہ ہے۔ انسانی سماج میں ایسی پیش آمدہ صورتوں کے ضمن میں ہر قسم کے فکر و فلسفے سے ناوابستگی اختیار کرتے ہوئے فلاحی و اصلاحی اخذ و استفادہ کی سبیل ہی صائب طرزِ عمل شمار ہو گی۔ قران پاک میں علم (Knowledge) اور حکمت وہدایت (Guidence) کو بالترتیب مادے اور روح کی جان پہچان کے طور پر انسان کو ودعیت کیا گیا ہے۔ اوّل الذکر کو'' وعلّم اٰدم الاسماء کلّھا''(۱۰) کی صورت اور موٴخر الذکر کو ''فامّا یاتینّکم مِّنّی ھُدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون''(۱۱) کے الفاظ میں تسطیر کیا گیا ہے۔ ایک ارزش میں خودی کے عرفان کی منہج ہے تو دوسری میں

بے خودی یعنی اجتماعی نشوو ارتقا کا سامان۔ اک علم ہے کہ باشعور بھی ہے اور اک علم ہے کہ کہ باشعور نہیں۔ اسی تقسیم کے تناظر میں جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں خطّ امتیاز کھینچا گیا تھا۔ غور کیا جائے تو تہذیب و تمدن کے ہر ارتقائی قدم پر یہی طریقت اسلامیوں کی رہی ہے کہ اس دینِ فطرت کے پیروکاروں جسے اس کے شارع ﷺ نے "اَلدِّینُ النَّصِیحَۃ" کہا ہے۔(۱۲) واضح رہے کہ شریعت کے معنی ہی رواں دواں پانی کے گھاٹ یا آبی سُوتے کے ہیں (۱۳) جس کا پانی نڈھال ہو کر رک رہے تو چشمہ شریعہ کے بجائے کریہہ بن جاتا ہے۔

یہ طرزِ عمل ایک حرکی حکمت عملی ہے اور بقائے حیات کی ضامن بھی۔ تبدیلی کا عمل کائنات کی سب سے بڑی سچائیوں میں سے ہے اور جو حیاتیاتی پیکر فطرت کی اس تغیراتی خاصیت سے مطابقت پزیری میں غفلت یا سستی کا مظاہرہ کرتا ہے، ارتقائی ثمرات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور تاریخ میں ایسی محرومیاں بڑے بڑے ڈائنوسارس کو بھی فوسلز میں بدل جانے پر منتج ہوئی ہیں۔ اس کے مقابل مادے کی فعالی صورتوں کو قبولنے یعنی سائنسی اور تکنیکی ترقیوں میں بھرپور حصہ لینے سے نشوو ارتقا کی اگلی منزلوں تک رسائی کی قابلیت نصیب ہوتی ہے۔ ہنری برگساں سماجی تبدیلیوں کی ارتقائی نوعیت کے ضمن میں رقم طراز ہے:

"To exist is to change,to change is to mature,to mature is to go on creating oneself endlessly (14)"

پس یہ بات توطے ہے کہ فی زمانہ کاروانِ ہستی سے ہم قدم رہنے کے لیے ورچوئل تعاملات سے صحت مندانہ ربط ضبط بنانا شرط ہے۔ آج کسی بھی ملک کی سلامتی، استحکام اور نمو یافتگی کا اندازہ اس کی دفاعی اور جارحیتی صلاحیتوں سے زیادہ آن لائن معاشی سرگرمیوں اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی کی استعدادِ کار سے لگایا جاتا ہے۔(۱۵) اپنے سماجی، ثقافتی اور اقتصادی امور کی برقیائی تحصیل و ترسیل سے متعلق معیاری شعریات ترتیب دینے اور ضابطۂ عمل وضع کرنے میں غفلت یا سستی دکھانے والی اقوام و ملل بتدریج اپنی ثقافتی نسل کشی (Cultural Genocide) سے دوچار ہو کر تاریخِ عالم کے حاشیے میں پناہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ پس چاہیے یہ کہ ہم اس سحر کار دنیا کی مضرت رساں مگر ناقابلِ تردید (Irresistable) دلچسپیوں اور ترغیبات سے بچنے کے لیے نظری اور اطلاقی طور پر کوئی قابلِ عمل حفاظتی حکمتِ عملی عوام الناس کے سامنے پیش کریں۔ ن۔ م راشد کے "وزیرِ چنیں" کو تو آمرانہ بیانیوں کی فکری آلودگی سے نجات کے لیے شیراز کے نائی کی سوجھ ہی گئی تھی(۱۶) مگر مادیت مرکوز چند حلقوں میں بٹتی ہوئی جدید دنیا کے غیر اعلانیہ اس نئے ورلڈ آرڈر اور اس کے منہ زور عالمی مکڑ جال (WWW) کی استحصالی کار فرمائی سے رستگاری کا اُپائے کرنے والا شہ سوار ابھی دور کی گردِ راہ میں بھی سجھائی نہیں دے رہا۔ زمانے کی یہ تشویش ناک صورت حال علامہ اقبال کی نظم "زمانہ" یوں موزوں ہوئی ہے :

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

انیسویں صدی کا دورانیہ مختلف عالمی تہذیبوں کے ادغام و اتصال کے حوالے سے بہت نمایاں رہا ہے۔ عالمِ پیر رو بہ زوال ہوا اور تہذیبِ مغرب کی کوکھ سے ایک جہانِ نو کے آثار ہویدا ہو چلے۔ انیسویں صدی کا مقتدر استعارہ اگر اسٹیم انجن تھا تو بیسویں صدی نے اسے کمپیوٹر سے بدل دیا۔ اب اکیسویں صدی نے سوشل میڈیا کی صورت ورچوئل حقائق پر مشتمل ایک الگ ہی دنیا تخلیق کر ڈالی ہے۔ انسانی معاشرہ رنگ و نسل اور زبان و ایقان کی حصار بندیوں سے نکل کر تہذیبی، سیاسی، معاشی اور انتظامی منطقوں میں پناہیں تراش رہا

ہے۔ میڈیائی وساطت سے اگر ایک طرف مغربی طرز کی لبرل جمہوری ہیئتِ حاکمہ مثالی حکومتی نظام قرار پا رہی ہے تو دوسری طرف ہالی ووڈ فلموں کا پروردہ کلچر لطیف نفسیاتی حربوں کی وساطت سے دنیا کے طول و عرض کو متاثر کرتا آیا ہے۔ آج بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے مصنوعات کی پیداور کو بڑھا کر اور نتیجتاً اس پر اٹھنے والے اخراجات کی اوسط مقدار کم کر کے ترقی پزیر ممالک کی صنعت و حرفت کا دیوالیہ نکال دیا ہے اور میڈیائی پراپیگنڈا اس مصنوعاتی افراط کی کھپت کے لیے مصنوعی ضروریات کا شعور اجاگر کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ گلوبل ویلج نئی محلہ سازی کے تحت مخصوص ترجیحات کی حصار بند آبادیوں (Gated-Communities) میں تبدیل ہوا جاتا ہے جس میں مکسلے کی تخیلی سماجی فعالیتیں پوری طرح فعال نظر آتی ہیں۔ سٹاک ہوم سنڈروم کا عارضہ ایک آفاقی قدرِ اشتراک ہو چلا ہے۔ مکسلے نے جو بات صیغہ واحد مذکر غائب کی مخاطبت میں مسطور کی ہے، ہم سب پہ انطباق کا جواز بنائے جاتی ہے:

"He had won the the victory over himself.He loved Big Brother" (17)

کسی بھی جدید تر افادہ پرست گروہ کا مجموعی بیانیہ ایک پیکج کی صورت قبول نہ کرنے کی پاداش میں تنہائی مقدر ٹھہرتی ہے۔ فیض کی تخلیقی لائن "ہم اہلِ صفا مردودِ حرم" اس تناظر میں گنگنایئے تو معنی کا چراغاں ہوتا ہے۔(۱۸) اگرچہ اس منظر نامے کو انسانی سماج کی جدلیاتی حرکیات کا فطری وقوعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر مابعد جدیدیت کے بیشتر ناقدین اسے تشکیلی اور ساختیہ ہی خیال کرتے ہے۔

سوشل میڈیائی سماج سمعی علوم کی بجائے بصری علوم و فنون پر اپنی توجہ مرتکز کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا ہماری دانش گاہوں، تحقیقی اداروں اور ممبر و محراب پر براجمان ہستیوں کو مزاجِ خانقاہی ترک کر کے رسمِ شبیری زندہ کرتے ہوئے اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری کے طور پر "بصائر" کے جیسی منضبط سرگرمیوں کی عملاً حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے کیا فلسفۂ عملیت موزوں کیا ہے:

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے جلوت میں معاذاللہ کہہ دینا

یادش بخیر! ایسی پیغمبری اُفتاد آ پڑنے کو مولانا حالی نے "وقتِ دعا" قرار دے کے مابعد الطبعیاتی ذرائع سے استغاثہ کی راہ سدھائی تھی، اور دعائے مسنون کی شعریات حالیؔ کے شاگردِ معنوی یعنی علامہ اقبال نے بخوبی آئینہ کر دی تھیں :"در دعائے نصرت آمیں تیغِ اُو"(۱۹) یعنی عملی جدوجہد دعا کا لازمہ ہے۔

ضعفِ بصر سے نہیں، ضعفِ بصیرت سے بدھیا بیٹھتی ہے ورنہ جاننا چاہیے کہ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری ازمنۂ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ فانوس کے حصار میں روشن شمع کو پھونکوں سے کوئی لرزش نہیں ہوتی۔ کعبے کو صنم خانوں سے پاسباں میسر آتے بھی چشمِ فلک نے کئی بار دیکھے ہیں۔ آرویل اور مکسلے کے مذکورہ ناولوں میں ظلم و تشدد اور ترغیب و تحریص کی پالیسیاں ریاستی ضمیر سے ہم آہنگ اوبرین اور مصطفی مانڈ جیسے کردار ہی پیدا نہیں کرتیں بلکہ ونسٹن اور وحشی جان جیسی مزاحمی شخصیات کو بھی جنم دیتی ہیں جن کی کارگاہِ فکر میں تشکیک اور بغاوت کے عناصر ڈھلتے اور انھیں مزاحمت کاری پر اکساتے ہیں۔ یہ ایک الگ وقوعہ ہے کہ ادارہ جاتی ہیئت حاکمہ انھیں بے بس کیے دیتی ہے۔ لہٰذا "بریو نیو ورلڈ"، 'وَن فلیو اوور اینڈ ککوز نیسٹ" اور "ڈارک نیس ایٹ نون" وغیرہ میں ایسی مزاحمتی قوت بالترتیب خودکشی، قتل اور سزائے موت سے دوچار کر دی جاتی ہے تو ایسے کئی دیگر ناولوں اور ڈراموں میں ریاستی بیانیوں

سے الگ سوچ کی سزا معاشی پابندیوں، خود سپردگی پر منتج ہوتی پسپائیوں اور انتشارِ آدرش کی صورت ذات کے بحرانوں یا لغو کیفیتوں کی شکل میں دکھا کر عبرت کے سامان کیے گئے ہیں۔ یہاں معروف دانش ور دیویندر اسّر کی یہ بات قابلِ حوالہ ہے کہ:

"ادارہ بندی میں غیر مہذب انسان کی نجات اگر پاگل پن اور خودکشی میں ہے تو پارٹی ممبر کی نجات مکمل خود سپردگی میں ہے۔" (۲۰)

سوچنا چاہیے کہ کیا یہ "ناکام" کردار منصوبہ بند ریاستی بیانیوں سے عدم اتفاق کی صورت بے ثمر گردانے جائیں گے؛ حاشا و کلّا۔ کبھی کبھی آدرش کی شیریں کو حاصل کرنے کے لیے فرہاد دوراں "ضربِ کلیمی" کے بجائے "حکمتِ سقراطی" بروئے کار لانا مناسب جانتا ہے۔

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو دے سکا

ادبی تنقید کے تاریخی دبستان کا بانی طین تونسل، لمحہ اور ماحول کا سہ ابعادی تنقیدی پیمانہ دے کر تخلیق کار کی اُپج اور تخلیقی شخصیت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا، جو محلِ نظر بات ہے۔ محبت میں جنوں آثاری نہ ہو تو نری مصلحت کوشی ہے، یونہی تخلیق ترجمانی محض نہیں ہوتی، البتہ فی الجملہ ادب میں سماجی تعبیر کا عنصر ہی غالب رہتا ہے۔ مارکس اور اینگلز کے انتقادی معیاروں کے مطابق روحِ عصر کو اپنے بطن میں سموئے مذکورہ ناولوں میں کمال کا ترفع (Sublimity) در آیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عہدِ رواں کی ورچوئل دنیا نے عشق نبرد پیشہ کو ایک نئے عرصۂ امتحان میں ضرور لا کھڑا کیا ہے مگر اس مجرد فرہاد کی منزل تو اب بھی وصلِ شیریں ہی ٹھہرے گی۔ شرطِ وصال بھی وہی جوئے شیر لانا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب کارگاہِ عمل یعنی کوہِ بے ستوں ایک وسیع سلسلہ بچھائے WWW کی صورت اپنے سنگین وجود کو گرانڈیل ترکیبے ہوئے ہے اور جوئے شیر اس سلسلہ ہائے علم و دانش میں موجود مِس انفرمیشن اور غیر متعلقہ مواد کے بھُس سے مطلوبہ معلومات کی سوئی تلاشنا ہے۔ خسرو کی قائم مقام یہاں نوع بہ نوع بیانیوں کی کثرت اور خدشات و ترغیبات کی شدت ہے کہ حصولِ مقصد کی راہ کا روڑا بنتی ہیں؛ جب کہ ماؤس یا کرسر کی صورت جدید تیشے شر رفشانیوں کے لیے اپنے اپنے فرہادوں کی راہ تکتے ہیں۔ "کہتا ہے کوئی بت مجھے پتھر سے نکالو"۔

بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے اور تقاضا کرتی ہے کہ اسے غیر معمولی حکمت عملی سے نبھایا جائے۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ وہ پُر حکمت الوہی کتاب جو رہبر دوعالم ﷺ نے ایسی گنجلک مہموں (Complicated Challenges) کی عقدہ کشائی اور ان کے حسبِ حال صائب طرزِ عمل اختیار کرنے کے حوالے سے ہمیں عطا فرمائی تھی، کھولی جائے۔ یہ مبارک کتاب ہمیں خدا، کائنات اور انسان کے سہ ابعادی تعاملات کا ہر میکانزم کھول کھول کر سمجھاتی اور انسانی آنکھوں کے سامنے روبہ عمل وقوعوں کی مدد سے اس کی مثالیں پیش کرتی ہے۔ یہاں عطا کردہ ضابطۂ حیات میں سوشل میڈیا ہی کیا اس نوع کے کسی بھی فتنۂ آخر زماں کی امکانی صورتوں کے ضرر رساں لوازمات سے بچنے کے لیے "تقویٰ" کو حفاظتی اقدام قرار دیا گیا ہے جو اس نظریے کو دل و جان سے قبول کرنے کا بہترین ثمرہ اور خدا کے ہاں اکرامِ آدمیت کا معیار ہے۔ (۲۱) زمانۂ جاہلیت میں "کریم" کا لفظ اعلیٰ حسب نسب والے فیاض طبع انسان کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے ہاں بالعموم اس کا ترجمہ "خوفِ خدا" یا "پرہیز گاری" کیا جاتا ہے اور یوں اس بلیغ مشار کے بہت سے مرادی منطقے نایافت و

نارسائی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ہم اس لفظ کے دیگر قرآنی استعمالات و مشتقات کو مد نظر رکھ کر معنویاتی تجزیے کی کوشش کریں تو اس کا مفہوم نظریۂ اسلام کے شعور و عرفان سے مستنیر ہو کر اپنی زندگی کے بارے میں اس عرفان کی مقتضی سنجیدگی روبہ عمل لانے سے عبارت ہے۔ (۲۲) تقویٰ ایک نپا تلا (سنجیدن بمعنی تولنا) مثبت رویہ ہے جس کے مقابل لفظ "فجور" ایک غیر ذمہ دارانہ فکر و عمل پر مشتمل سرگرمی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ (۲۳) یعنی نفسِ انسانی میں صائب اور ناروا منہاج کا شعور قدرت کی طرف سے ارزاں کیا گیا ہے۔ راستکاری میں کامیابی اور کج روی میں بربادیوں کا سامان۔ یہی سکہ رائج الوقت ہے؛ دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم۔

عہدِ رواں کا فکری منظر نامہ شاہد ہے کہ انسان نے اپنے مابعد الطبعیاتی ایقان سے بے نیازی کبھی قبول نہیں کی۔ فی زمانہ دنیا تہذیبی اور ثقافتی طور پر ماڈرنائز تو ہو رہی ہے مگر ماڈرنیٹی کی تشکیلی مقتضیات یعنی انسان مرکزیت (Humanism)، اندھی عقلیت پرستی (Rationalism) اور فکری بے مہاری (Freedom of Thought) سے گریز پا بھی ہے کہ یہ سبق اسے دو عالم گیر جنگیں بھگتانے کی صورت بعد از خرابیٔ بسیار ملا ہے۔ معروف مغربی دانش ور محمد مارماڈیوک پکتھال نے اس ایقان کی تہذیبی اہمیت واضح کرتے ہوئے جدید دنیا کے الحادی فکر و فلسفہ کی سطحیت یوں آشکار کی ہے:

> "Modern western civilization is not a civilization, it is a savegry and I know this because I was a savege before.Civilisation cannot be produced by a system of thought with out a belief in hereafter (24)".

پس سوشل میڈیا کے جدید تکنیکی لینڈ سکیپ کے حسبِ حال اپنے ہاں جدّتِ کردار لانے کے لیے ہمیں اسی کتابِ زندہ میں غوطہ زن ہونے کی ضرورت ہے۔ اسلامی طرزِ حیات اس ورچوئل سماج کے نفسیاتی چیلنجز سے صحت مندانہ انداز میں نپٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مذہبی اقدار کی تعیینِ وقت ہمیں نیٹ پہ جمے بیٹھے سکرولنگ کی لَت (Scrolling addiction) میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے۔ ہر روز بارگاہِ الٰہی میں کھڑے ہو کر صراطِ مستقیم سدھانے کی التجا کرنا اور روشِ گمرہاں سے بچاؤ کے لیے توفیقِ عمل مانگنا معرکۂ خیر شر کے ہر میدان میں عجز پیشہ انسان کے لیے مابعد الطبعیاتی قویٰ کی ارزانی کا باعث بنتا ہے۔ مکتبِ عشق میں نفی اثبات کا سبق لینے والی ملت کا ہر فرد محض اسی توفیق کے سبب آتشِ نمرود کی تپش اور بحرِ ظلمات کی غرقابیوں سے محفوظ و مامون ٹھہرتا ہے۔ تہذیبِ عشق اسے آدابِ وفا کی پاسداریاں کرنے اور نفسِ امّارہ کی ہر ترغیب و تحریص سے گریز پا رہنے کا شعور دیتی ہے۔ ہمارے نبی ﷺ معلم مبعوث کیے گئے ہیں جن کے فلسفۂ تعلیم و تدریس میں متعلمین کے نفسیاتی تقاضوں کے پیشِ نظر تدریسی سرگرمی میں توازن و تناسب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تبلیغِ دین میں "حریص" ہونے کے باوصف آپ ﷺ نے دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں کو رات کے اوقات میں جاری نہیں رکھا۔ آج سوشل میڈیا کی پیش کردہ علمی منڈی (Knowledge Market) کے لامحدود معلوماتی ذخیروں سے اخذ و استفادہ کی صائب منہج اختیار کرنے میں اسوۂ حسنہ بھرپور رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ حکومتی سربراہی میں ٹیکنالوجی کے ماہرین ایسی حکمتِ عملی ترتیب دیں کہ غیر مطلوبہ مواد سے اجتناب کی آسان سبیل ہاتھ آ سکے۔ مخرب الاخلاق ویب سائٹس پر سختی سے پابندی رہنی چاہیے۔ خاص طور پر ہمیں نسلِ نو کی تربیت اس منہج پر کرنی ہے کہ پُر فتن چیلنج سے سرخروئی کو یقینی بنا سکیں اور اس کے لیے بھرپور سوشل میڈیا ایمرجنسی کا روبہ عمل آنا

وقت کا تقاضا ہے۔ فی زمانہ حسرتِ مواد کے بجائے کثرتِ مواد ارمانِ وصل کا خون کیے جاتی ہے۔ اس مرض کا چارہ مسیحائے آخر الزماں ﷺ نے قرانِ حکیم کی صورت ہمیں ارزاں کر رکھا ہے۔ اسی نسخے میں، اور صرف اسی نسخے میں سامانِ مسیحائی ہے۔ یادش بخیر، اتفاقاتِ زمانہ کے شناور میر تقی میرؔ نے فتنۂ باطنی سے نبرد آزمائی کی یہ حکمت یوں شعر یائی تھی :

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میرؔ
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

علم و حکمت کا حصول تقاضائے بشریت ہے مگر ایسے الوہی خزینوں کا مادیت پرستانہ استعمال ان کی افادیت پر سوالیہ نشانات کھڑے کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں علی اصغر عباس کی نظم "روشنی کی تجارت" کا یہ اقتباس چبا چبا کر پڑھنے کے قابل ہے:

"روشنی کی تجارت
سفیرانِ شب کو بہت راس آئی
ستاروں کی قیمت میں جگنو خریدے
انھیں چاند سورج کا لیبل لگا کے
شہابوں کے نرخوں پہ بیچا"(۲۵)

ایسے پُر فتن عہد میں صائب ترین طرز عمل کو نبی اکرم ﷺ نے خار دار جھاڑیوں بھرے جنگل سے اپنے لباس کو بچا بچا کر گزران کرتے مسافر کے محاکاتی تصور کی صورت بھی بیان کیا ہے۔ ایسے راہرو کے دل میں دبی گُلِ مراد کی خواہش اس کے ذوقِ سفر کو خلشِ خار سے خائف نہیں ہونے دیتی۔ مذکورہ سالکِ راہ کی "لَا" اور "اِلَّا" سے نمو یافتہ دو گونہ صفات کا تذکرہ عرفی شیرازی یوں موزوں کرتے ہیں:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

یہاں آب و آتش کی علامتیں فتنۂ روزگار اور خواہشاتِ نفسانی کی ترجمان ہیں جن کے چنگل سے وہی پیکرِ حیات بچ کر گزر سکتا ہے جسے شعلۂ پُر کالہ اور غرقاب کار بھنوروں سے نبرد آزمائی کا قرینہ آتا ہو۔ یہ قرینہ روایت اور جدّت سے بیک وقت انسلاک کا متقاضی ہے جس کے معجزاتی سنگھم کا استنباط "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ" کی آیۂ مبارکہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔(۲۶) اسی سنگھم کے پاک پتن سے حاصل کردہ آبِ حیات (سوم رَس) انسانیت کے مرضِ کہن کا چارہ ہو سکتا ہے۔ شبلی نعمانی اس ضمن میں رقم طراز ہیں: "ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے:

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق
ہر ہوس ناکے نہ داند جام و سنداں باختن"(۲۷)

ایسے تمام حیات آفریں اقدامات اور ان کی تربیت کے قرینے علامہ اقبال نے قرآن حکیم سے ماخوذ اپنی مثنویوں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں بڑی صراحت سے دہرائے ہیں جو بلا تفریق ہر انسان کے لیے یکساں مفید ہیں۔ "صلائے عام ہے

یارانِ نکتہ داں کے لیے۔" ایک چینی مفکر نے حیاتِ انسانی کی شعریات سے متعلق حکمتِ چینیاں کے مفسر چانگ چاؤ کا پُر مغز(Pregnant)مقولہ نقل کیا ہے:

"جو لوگ اُن کاموں کو اہمیت نہیں دیتے جنھیں عام لوگ اہمیت دیتے ہیں، صرف وہی لوگ اُن چیزوں کو اہمیت دے سکتے ہیں جنھیں عام لوگ اہمیت نہیں دیتے۔"(۲۸)

صدیوں پرانے اس جملے کو چینی قرأت کاروں کی باعمل قرأت نے زندہ کیا تو یہ گراں خواب قوم آج اقوامِ عالم کی "امامت "کا منصب سنبھال رہی ہے۔ادھر ہم، کہ لاریب آیتوں کے امین تھے مگر قرأت کا سلیقہ گم کیے بیٹھے ہیں۔ یاللعجب!! "گرفتہ چینیاں احرام ومکّی خفتہ در بطحا"۔ ایسے ہی اتفاقاتِ زمانہ پہ تنبیہ تسطیر ہوتی ہے؛ فاعتبروا یااولی الابصار۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) رشید حسن خاں: گنج ہائے گراں مایہ، لاہور: اردو اکیڈمی، طبع دوم، ۱۹۴۴ء، ص ۱۴۰

(۲) جارج آرویل: ۱۸۸۴ء، لندن: سیکر اینڈ وار برگ، ۱۹۴۹ء

(۳) ترجمہ: ''فصلِ بہار میں ہریاول کی فراوانی اتنی ہے کہ بسا اوقات چرنے والا اَپھر کر ہلاک ہو جاتا ہے۔''
غلام علی، جسٹس (مترجم): سیرت المختار، تلخیص، خیار القول فی سیرۃ الرسول، مصنفہ: شیخ مصطفیٰ الفلایینی، لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، س ن، ص ۱۳۳

(۴) شرر، عبدالحلیم: فردوسِ بریں: لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۴۷

(۵) ہکسلے، آلڈس: Brave New World، لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷

(۶) ''رس'' کے لفظی معنی لذت کے ہیں جب کہ سوم ایک نشہ آور رَس دینے والے درخت کا نام ہے۔ ہندوی روایات کی رو سے سوم رَس سے مراد ایسی شراب جس کا پینا داخلِ عبادت خیال کیا جاتا ہے۔
ر۔ ک: (اردو لغت (تاریخی اصول پر) کراچی، اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۱)

(۷) دیویندر اسّر: دیو ہیکل ادارے اور ذات کا بحران، مشمولہ: شب خون، الہ آباد، جلد ۲، ش ۲۰، ۱۹۶۸ء، ص ۸

(۸) تحسین فرقی، ڈاکٹر، جستجو، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴

(۹) کوہن، برنارڈ ایس: Colonialism and its forms of knowledge، امریکہ: پرنسٹن یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶

(۱۰) ترجمہ: ''اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے''۔ القران، سورۃ: البقرۃ، آیت: ۳۱

(۱۱) ترجمہ: ''جب تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا کہ) جنھوں نے میری طرف سے ہدایت کی پیروی کی تو ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے''۔ القران، سورۃ: البقرۃ، آیت: ۳۸

(۱۲) ترجمہ: ''دین خیر خواہی (کا نام) ہے۔''
غلام رسول سعیدی: شرح صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب نمبر ۲۲، لاہور: فرید بک سٹال، ۲۰۰۲ء، ص ۴۷۲

(۱۳) سجاد میر ٹھی، زین العابدین (مرتب): بیان اللسان (عربی اردو ڈکشنری)، کراچی: دارالاشارت، ۱۹۷۴ء، ص ۳۹۷

(۱۴) ہنری برگساں: Creative Evolution، مترجم، آرتھر ملر، لندن، میکمیلن اینڈ کمپنی، ۱۹۶۴ء، ص ۸

(۱۵) محمود شام: آیئے آن لائن سماج کی تیاری کریں (کالم)، مشمولہ: روزنامہ جنگ، ۷/ جون ۲۰۲۰ء

(۱۶) راشد، ن۔م: کلیاتِ راشد، دہلی ۶، کتابی دنیا، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۹

(۱۷) ہکسلے، آلڈس: Brave New World، لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷

(۱۸) اس نظم کا عنوان: ''وَیَبقیٰ وَجہُ رَبِّکَ'' ہے۔ پاک و ہند کی معاصر مزاحمتی تحریکوں میں بے حد مقبول رہی کیوں کہ اس

میں پرولتاری طبقے کے منشوراتی نکات بڑی جامعیت سے شعر یائے گئے ہیں۔

ر۔ک: فیض احمد فیض: نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں،، س ن، ص ۶۵۷

(۱۹) اسرارِ خودی کے اس مصرعے میں دعائے مسنون کا یہ سبق پوشیدہ ہے کہ اسے بارگاہِ ایزدی میں بھیجتے ہوئے عمل کا زادِ راہ فراہم کیا جائے تو اجابت برائے استقبال آتی ہے، یعنی عمل دعا کا لازمہ ہے۔

(اقبال، علامہ: کلیات اقبال (فارسی)، لاہور: مکتبہ دانیال، س ن، ص ۴۳)

(۲۰) دیویندر اسّر: دیو ہیکل ادارے اور ذات کا بحران، ص ۷

(۲۱) متعلقہ فرمان یہ ہے: "اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ" جس کا ترجمہ محمد مارماڈیوک پکتھال نے اسلامی طرزِ عمل کے حوالے سے یوں کیا ہے: "Lo the noblest of you in the sight of Allah is the best in conduct." (القرآن، مترجم: محمد مارماڈیوک پکتھال،، لاہور: پاک کمپنی، سورۃ الحجرات، آیت ۱۳)

(۲۲) توشی از تسو: دینی اخلاقیات کے قرآنی مفاہیم، مترجم: ڈاکٹر خالد مسعود، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۸

(۲۳) ترجمہ: "پس اس کی بدکاری اور پرہیز گاری دل میں ڈالی" (القرآن، مترجم: امام احمد رضا خان بریلوی، لاہور: ضیاء القرآن، پارہ ۳۰، سورۃ: الشمس، آیت ۸)

(۲۴) محمد مارماڈیوک پکتھال، بحوالہ، محمد زاہد صدیق مغل: مسلم ماڈرن ازم اور مجتہدین کے ابہامات، مشمولہ: نظریات، جلد اوّل، ش ۴، ستمبر ۲۰۱۳ء، ص ۶۷

(۲۵) عباس، علی اصغر، روشنی کی تجارت، مشمولہ: استعارہ، شمارہ: ۱، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۶۹

(۲۶) ترجمہ: "اس نے دو سمندر (شیریں اور شور) بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے۔" (القرآن، پارہ ۲۷، آیت ۱۹)

(۲۷) شبلی نعمانی، سراج الدین محمد: مقالاتِ شبلی، مرتب: سید سلیمان ندوی، ج: ۳، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۸

(۲۸) لین یُو تانگ، جینے کی اہمیت، مترجم: مختار صدیقی، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۶ء، ص ۵۵۶

References

1. Rasheed Hassan Khan, Ganj Hai Gran Maya, Lahore: Urdu Academy, 2nd Edition, 1944, P.140
2. George Arwell, 1884, London: Sacar & War Barg, 1949
3. Ghulam Ali, Justic, (Translation), Seerat-ul-Mukhtar, Talkes, Khiyar al-Qool Fi Serat ul Rasool, Musanifa: Sheikh Mustafa Al-Flayni, Lahore: Maktaba Tameer Insaniyat, P.133
4. Shrar, Abdul Haleem, Firdous Bareen, Lahore: Sang-e-Meel Publications, P.47
5. Haxely, Oldis, Brave New World, London: Penguin Books, 1963, P.71
6. R.K, Urdu Lughat (Tareekhi Usolon Per), Karachi: Urdu Lughat Board, 1991, P.191
7. Dewander Asar, Dewhecal Idary aur Zaat ka Buhran, Mashmola: Shab Khon, Ilahbad, Vol.2, Issue.20, 1968, P.8
8. Tehseen Firaqi, Dr., Justojo, Lahore: Universal Books, 1987, P.14
9. Cohen Bernard S., Colonialism and its forms of knowledge, America: Prinston University, 1996, P.16
10. Al-Baqarah:31
11. Al-Baqarah:38
12. Ghulam Rasool Saeedi, Sharah Sahih Muslim, Kitab ul Eman, Chapter No.22, Lahore: Fareed Book Stall, 2002, P.472
13. Sajjad Merathi, Zain ul Abideen, (Muratib), Bayan ul Lisan, (Arabic, Urdu Dictionary), Karachi: Dara ul Isharat, 1974, P.397
14. Henry Bargasan, Creative Evolution, Translation: Arther Miller, London: MacMillan & Company, 1964, P.8
15. Mahmood Sham, Ayee Online Samaj ki Tiyari Karain (Column), Mashmola: Roznama Jang, 7 June 2020
16. Rashid, N.M., Kuliyat-e-Rashid, Dehli 6, Kitabi Duniya, 2011, P.239
17. Haxely, Oldis, Brave New World, P.71
18. R.K, Faiz Ahmad Faiz, Nuskha Hay Wafa, Lahore: Maktaba Carwan, P.657
19. Iqbal, Allama, Kulyat-e-Iqbal Farsi, Lahore: Maktaba Daniyal, P.43
20. Dewander Asar, Dewhecal Idary aur Zaat ka Buhran, P.7
21. Al-Hujrat:13

22. Toshi Aztso, Deni Ikhlaqiyat Kay Qurani Mafaheem, Translator: Dr. Khalid Masood, Lahore: Idara Saqafat Islamiya, 2005, P.118

23. Al-Shams: 8

24. Muhammad Marmadiyok Pikthal, Bahawala: Muhammad Zahid Siddquie Mughal: Muslim Modernism & Mujtahideen Kay Ibhamat, Mashmola: Nazriyat, 1st Edition, Vol.4, September 2013, P.67

25. Abbas, Ali Asghar, Roshni ki Tijarat, Mashmola: Istaara, Shumara 1, Al-Hamd Publication, October to December 2017, P.69

26. Para No. 27, Ayat: 19

27. Shiblee Nomani, Siraj ud Din Muhammad: Maqalat Shiblee, Muratib: Syed Suleman Nadvi, Islamabad: National Book Foundation, Vol.3, 1989, P.158

28. Leen Yu Tang, Jeene Ki Ahmiyat, Translation: Mukhtar Saddique, Lahore: Maktaba Jadeed, 1956, P.556